جزیرۃ العرب میں ظہور اسلام کا پس منظر

کوثر پروین

۵۷۰ء سے پہلے یعنی آپ کی ولادت باسعادت سے پہلے عرب اور پوری دنیا جہالت اور وحشت میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور تاریخ سے ثابت ہے کہ جب بھی کوئی قوم اپنے گناہوں میں حد سے بڑھی ہے تو اللہ نے ان کے درمیان ایک پرہیز گار اور نیک انسان نبی بنا کر بھیجا۔ جب بھی ظلم کی انتہا ہوئی کوئی نہ کوئی انسان نجات دہندہ بنا کر بھیج دیا گیا۔ جہاں کوئی فرعون پیدا ہوا وہاں موسیٰ کو بھیج دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ جو آپؐ سے ٦ سو سال پہلے نبی بنا کر بھیجے گئے لیکن ان کے بعد ان کی قوم ان کے عقائد کو بھول گئی اور ان پر نازل کی گئی کتاب انجیل میں کافی ردوبدل کر دیا گیا اور حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنالیا گیا۔ اسی طرح پوری دنیا میں مختلف نبیوں کو ماننے والے اپنی تعلیمات کو بھلا چکے تھے۔ عرب میں بھی حضرت ابراہیمؑ کا دین رائج تھا مگر یہ بھی دوسرے مذاہب کی طرح برائے نام تھا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے تعمیر کیے گئے خدا کے گھر کو بت خانہ بنا دیا گیا اور خدا کے بجائے ان کی پوجا ہوتی تھی اور لوگ حضرت ابراہیمؑ کے دین کو بھول چکے تھے۔ اور جو دین ابراہیمی پر قائم تھے وہ اس مذہب کے بہت سے عقائد بھول چکے تھے۔

جب پوری دنیا ذلت کی پستیوں میں گری ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ کو بنی نوع انسان پر رحم آ گیا اور اللہ نے دنیا میں اپنا محبوب پیغمبر کو نجات دہندہ بنا کر بھیجا۔ یہ نور جس نے پوری دنیا کی تاریکیاں ختم کر دیں عرب میں پیدا ہوا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے لیے عرب کو ہی کیوں منتخب کیا گیا۔ اس وقت دنیا کی دو بڑی طاقتیں ایران و روم بھی موجود تھیں اور اگر ان میں پیغمبر اسلام آتے تو ایسا ہو سکتا تھا کہ اسلام بہت جلد پوری دنیا میں پھیل جاتا اس کے باوجود اسلام کو عرب جیسے بے آب و گیاہ اور محور جہالت میں ایک در یتیم پر ہی کیوں نازل کیا گیا۔ اس تحریر میں ان اسباب کا احاطہ کیا جائے گا جن کی وجہ سے عرب میں اسلام کا ظہور ہوا۔

عرب کی مرکزیت

جزیرۂ نمائے عرب پرانی دنیا کے تمام معلوم براعظموں کے بیچوں بیچ واقع ہے اور خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا شمال مغربی گوشہ براعظم افریقہ میں داخلے کا دروازہ ہے۔ شمال مشرقی گوشہ یورپ کی کنجی ہے۔ مشرقی گوشہ ایران، وسط ایشیاء اور مشرق بعید کے دروازے کھولتا ہے اور ہندوستان اور چین تک پہنچاتا ہے اسی طرح ہر براعظم سمندر کے راستے بھی جزیرہ نمائے عرب سے جڑا ہوا ہے اور اس کے جہاز عرب بندرگاہوں پر براہ راست لنگر انداز ہوتے ہیں۔ اس جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے جزیرۃ العرب کے شمالی اور جنوبی گوشے مختلف قوموں کی آماجگاہ اور تجارت وثقافت اور فنون اور مذاہب کے لین دین کا مرکز رہ چکے تھے۔ اس جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے مسلمان ایک طرف تو عرب سے نکل کر عراق سے ایران، ترکستان، خراسان، کابل اور ہندوستان پہنچ گئے اور دوسری طرف شام سے ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور سپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، پھر جزائر ہند، جاوہ، سماٹرا اور چین تک ان کا گذر ہوا اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا جھنڈا لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لیے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لیے مناسب مرکز تھا۔ فرض کریں اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوتا پھر یہ کہ اس وقت دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لیے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا باآسانی ممکن ہو۔[1]

صحت نسب

شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابرہیمؑ کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی۔ توراۃ نے حضرت ابراہیمؑ کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے چنانچہ ریورنڈ فاسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں۔ قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے اور ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے **تاریخ الیہود فی بلاد العرب** نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت کی دو دلیلیں پیش کی ہیں۔[2] اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا ہے:

ملة ابيكم ابراهيم

ترجمہ: تمہارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب[3]

حضرت ابراہیمؑ تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل وعیال کا نظر آتا ہے اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے وہی خیمے ہیں وہی صحرا ہیں وہی مویشی ہیں۔ وہی بدویانہ زندگی ہے وہی رسم ورواج ہیں جن کو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھار دیا۔ وہی بیت اللہ، وہی حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:

> اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیریکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔[۴]

اہل عرب کو حسب ونسب کی حفاظت کا جو خیال ولحاظ تھا اس کے ذکر سے عرب کی تاریخ معمور ہے۔ چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اپنے باپ دادا کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑروں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے۔ قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلے میں موجود رہتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلہ نسب معلوم ہو سکتا ہے۔ اور اس پر بہت اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود اور اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلے میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا اس سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لیے نسل ابراہیمؑ کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔[۵]

دعائے ابراہیمی

عرب میں ظہور اسلام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق عرب سے تھا اور انہوں نے مکہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ یہ دعا مانگی تھی:

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایتک ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم

''اے ہمارے رب اور ان میں ایک رسول بھیج انہیں میں سے جو ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے''۔[۶]

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا نتیجہ تھا کہ آنحضرتؐ کو اللہ نے عرب میں مبعوث فرمایا اور آپؐ میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن کی خواہش حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔

پہلی خوبی یہ تھی کہ اس پر کتاب نازل ہو اور وہ لوگوں کو اس کی آیات پڑھ کر سنائے۔ اللہ نے حضرت محمدؐ پر قرآن مجید جیسی عظیم کتاب نازل کی جو آج بھی لوگوں کے سینے میں موجود ہے جس میں کوئی آدمی تبدیلی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے اور جو ساری دنیا کے لیے ہدایت اور آخرت کے لیے راہ نجات ہے۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ نہ صرف آیتیں سنائے بلکہ جہاں جہاں کتاب اللہ کے سمجھنے میں لوگوں کو دشواری پیش آئے تو اس کی تشریح وتوضیح قول وعمل سے کر کے ان کے ذہن نشین کرا دے یعنی انہیں کتاب کی عملی تعلیم دے۔

تیسری خوبی یہ ہو کہ وہ لوگوں کو دانائی اور حکمت کی تعلیم دے۔

چوتھی خوبی یہ ہو کہ لوگوں کے نفوس کو پاک کر دے انہیں شرک وکفر اور ظلم سے متنفر کر دے اور ہر قسم کی خامیوں اور کمزوریوں سے پاک کر کے انہیں اخلاق حسنہ سے آراستہ کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی تمام خواہشات کو پورا کیا اور آپ کی امت جب جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے مکہ میں اپنے محبوب پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ نبوت کے بعد فرماتے تھے کہ ''میں اپنے باپ کی دعا ہوں''۔

خانہ کعبہ

عرب میں ظہور اسلام کی ایک اور بڑی وجہ خانہ کعبہ تھی جس کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اللہ کے حکم سے تعمیر کیا اور جسکی طرف منہ کر کے تمام مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ یہی وہ خانہ کعبہ ہے جس کی وجہ سے عرب کو پوری دنیا میں جانا جاتا تھا اور اس کو اللہ کا گھر کہا جاتا تھا۔

خانہ کعبہ جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے تعمیر کیا تھا اس میں اور ظہور اسلام سے قبل خانہ کعبہ میں بہت فرق تھا۔ وہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کا گھر بنایا تھا مگر ظہور اسلام سے پہلے تک یہ کعبہ ایک بت خانے کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس

میں ۳۶۰ بت رکھے تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی۔ لوگ اللہ کو بھول چکے تھے اور اللہ سے مدد مانگنے کی بجائے ان بتوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا جاتا تھا۔ اس لیے خانہ کعبہ کو ان بتوں سے پاک کرنے کے لیے اللہ نے عرب کی سرزمین کو اسلام کے لیے پسند فرمایا۔ دور جہالت میں بھی خانہ کعبہ کا طواف، حج اور عمرہ وغیرہ ادا کیا جاتا تھا مگر کعبے کا احترام بہت حد تک ختم ہو چکا تھا۔ لوگ ننگے ہو کر کعبے کا طواف کرتے۔ شراب بھی پی جاتی تھی۔ اس لیے اللہ نے حضرت محمد ﷺ کے ذریعے اپنے گھر کو پاک کیا۔ لوگ خانہ کعبہ کا احترام کرنے لگے۔ ۲ ہجری میں اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم ملا اور حج فرض کیا گیا۔

اس وجہ سے عرب پوری دنیا میں ایک مذہبی مرکز کی حیثیت سے بھی جانا جاتا تھا۔ ہر سال پوری دنیا سے لوگ یہاں حج اور عمرہ کے لیے آتے۔ اس لیے یہاں سے اسلام کی آواز کو پوری دنیا میں پھیلانا ممکن تھا۔ خانہ کعبہ کی اسی مقبولیت کی وجہ سے ابرہہ نے بیت اللہ کو ڈھانے کی کوشش کی جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی سزا دی کہ وہ اولین و آخرین کے لیے عبرت بن گیا۔

عربی زبان

عربی زبان دنیا کی ان وسیع، شیریں، سلیس، پاکیزہ اور خوبصورت زبانوں میں سے ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے اس کے الفاظ کے مخارج بڑے سامعہ نواز، پیرایہ بیان بڑا ابلیغ، تراکیب بڑی دل آویز اور صوتی اثرات بڑے دقیع اور موثر ہوتے ہیں۔ پھر اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک ہی مادہ سے (اکثر صرف تین حروف سے) مختلف قسم کے افعال نکلتے ہیں۔ جن میں بسا اوقات سات حروف تک ہوتے ہیں اور جن کے معنی بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ صلات کے بدلنے سے بھی معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ بات کو پر اثر بنانے کے لیے مجاز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ کا اور معانی میں وقعت اور گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کے لیے مرادفات کا استعمال ہوتا ہے، الفاظ کی آخری آواز (اعراب) کو حروف کے ذریعہ ہی ادا کیا جاتا ہے انہیں لکھا نہیں جاتا چنانچہ زبر، زیر اور پیش کو علامت کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے حروف سے نہیں۔ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حروف تہجی بھی زیادہ ہیں جن کی وجہ سے ہر قسم کے الفاظ لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے قالب میں ڈھال لینے اور بدل کر خوبصورت شکل دے دینے میں یہ زبان اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کی یہی امتیازی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر خدا نے اپنا کلام اتارنے کے لیے اس زبان کا انتخاب فرمایا اور قرآن کریم جیسی معجز کتاب اس زبان میں اتاری جو بلا اختلاف عربی زبان و ادب کی وہ واحد کتاب ہے جس کی ایک آیت کی مثال بھی عرب کا بڑا سے بڑا شاعر اور ادیب اب تک نہ لا سکا۔ قرآن کے بعد اسی زبان میں اللہ کے پیغمبر محمد رسول ﷺ نے اپنی حدیثیں ارشاد فرمائیں جو عربی ادب میں بلا اختلاف اپنی فصاحت و بلاغت اور معنوی جامعیت میں شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ [۵] مولانا مودودی سیرت سرور عالم میں لکھتے ہیں:

بلند خیالات کو ادا کرنے اور خدائی علم کی نہایت نازک اور باریک باتیں بیان کرنے اور دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی زبان نہیں ہے۔ اس زبان کے مختصر جملوں میں بڑے بڑے مضامین ادا ہو جاتے ہیں اور پھر ایسا زور ہوتا ہے کہ دل میں تیر و نشتر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ ایسی شیرینی ہوتی ہے کہ کانوں میں رس پڑتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نغمہ ہے کہ آدمی بے اختیار جھومنے لگتا ہے۔ قرآن جیسی کتاب کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت ہے پس یہ اللہ کی بہت بڑی حکمت تھی کہ اس نے تمام جہانوں کی پیغمبری کے لیے عرب کے مقام کو منتخب کیا۔[۸]

ظہور اسلام سے قبل کی عربی زبان اتنی عمدہ فصیح اور بلیغ ہے کہ اس کا مقابلہ جدید یورپ کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کیا جا سکتا ہے۔ ظہور اسلام میں زمانہ جاہلیت کا سب سے بڑا کام عربی زبان کی تکمیل ہے۔ پی۔ کے۔ ہٹی لکھتا ہے ''اسلام کی فتح اور بالادستی بڑی حد تک ایک زبان بلکہ ایک کتاب کی فتح و کامرانی ہے''۔[۹]

غیر ملکی تسلط سے آزادی

عرب کا ملک تخلیق عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا۔ شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی۔ بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا۔ یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے۔ سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی۔ عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران و روم کی سرحد پر واقع تھا۔ مگر وہ دونوں اپنی حرص و آز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہے۔ گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی مگر قدرت الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا۔ یہ تمام اہتمام و انتظار اس لیے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے۔ ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کارآمد ہو۔[۱۰]

مشہور مؤرخ پی۔ کے۔ ہٹی کا کہنا ہے کہ ''صحرا اور بنجر ریگستان کی وجہ سے ہی عرب صدیوں دوسروں کی غلامی سے بچے رہے''۔ چونکہ انہیں صحرا کے خلاف مسلسل نبرد آزما رہنا پڑتا اس لیے حالات نے انہیں جفاکش بنا دیا۔ صحراؤں میں ان کی لامحدود زندگی نے ان میں حریت اور انفرادیت پسندی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ وہ آزادی سے پیار کرتے اور انہوں نے کسی کی بالادستی کبھی قبول نہیں کی۔ یوں تاریخ کے دور اول کے مورخوں نے عربوں کی حریت پسندی اور آزادی سے محبت کی بے حد تعریف کی ہے۔ یورپی مورخ سٹار بو نے لکھا ہے کہ ''عرب واحد قوم ہے جس نے سکندر کے دربار میں اپنا

سفیر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ سکندر عرب کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا''۔

قبائلی وشورائی نظام

قبائل کا سیاسی نظام نیم جمہوری تھا۔قبیلہ کا شیخ منتخب ہوتا تھا اور عام افراد اس کی قابلیت، شجاعت اور فہم وفراست کے علاوہ سابقہ سردار سے اس کی قرابت داری کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ایک دفعہ جو شیخ منتخب ہو جاتا تو تمام لوگ اس کی اطاعت کرتے لیکن وہ فیصلے کرنے سے پہلے قبیلے کے بااثر لوگوں سے مشورہ لے لیتا تاہم اگر وہ کسی قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا تو اس کے قبیلے کے لوگ عزت وناموس کی خاطر کٹ مرتے۔عربوں کا یہ قبائلی اور جمہوری نظام اسلام کے سیاسی اصولوں کے نفاذ میں بہتر معاون ثابت ہوا اور عربوں نے اسلام کے شورائی نظام اور خلیفہ کے منتخب ہونے کو بہت خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیا۔[11]

دین ابراہیمؑ میں قریش کی بدعات

قریش نے دین ابراہیمی کو پورے طور پر نہیں چھوڑا تھا۔چنانچہ وہ بیت اللہ کی تعظیم اور اس کا طواف کرتے تھے۔حج وعمرہ کرتے تھے، عرفات ومزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور ہدی کے جانوروں کی قربانی کرتے تھے۔البتہ انہوں نے اس دین ابراہیمی میں بہت سی بدعتیں ایجاد کر لیں تھیں مثلاً:

قریش کی ایک بدعت یہ تھی کہ وہ کہتے تھے ہم حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں، حرم کے پاسبان، بیت اللہ کے والی اور مکہ کے باشندے ہیں۔کوئی شخص ہمارا ہم مرتبہ نہیں اور نہ کسی کے حقوق ہمارے حقوق کے مساوی ہیں اور اسی بنا پر اپنا نام حمس (بہادر اور گرم جوش) رکھتے تھے۔لہذا ہمارے شایان شان نہیں کہ ہم حدود حرم سے باہر جائیں چنانچہ حج کے دوران یہ لوگ عرفات نہیں جاتے تھے اور نہ وہاں سے افاضہ کرتے تھے بلکہ مزدلفہ ہی میں ٹھہر کر وہیں سے افاضہ کر لیتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے اس بدعت کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا:

ثم افیضو من حیث افاض الناس

ترجمہ: یعنی تم لوگ بھی وہیں سے افاضہ کرو جہاں سے سارے لوگ افاضہ کرتے ہیں۔[12]

ان کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ وہ کہتے تھے کہ حمس (قریش) کے لیے احرام کی حالت میں پنیر اور گھی بنانا درست نہیں اور نہ یہ درست ہے کہ بال والے گھر (یعنی کمبل کے خیمے) میں داخل ہوں اور نہ یہ درست ہے کہ سایہ حاصل کرنا ہو تو چمڑے کے خیمے کے سوا کہیں اور سایہ حاصل کریں۔

ان کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بیرون حرم کے باشندے حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں اور بیرون حرم سے کھانے کی کوئی چیز لے کر آ دیں تو اسے ان کے لیے کھانا درست نہیں۔ان کی ایک اور بدعت یہ بھی تھی کہ انہوں نے بیرون حرم کے باشندوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ حرم میں آنے کے بعد پہلا طواف حمس سے حاصل کیے ہوئے

کپڑوں ہی سے کریں چنانچہ اگر ان کا کپڑا دستیاب نہ ہوتا تو مرد ننگے طواف کرتے اور عورتیں اپنے سارے کپڑے اتار کر صرف ایک چھوٹا سا کھلا ہوا کرتہ پہن لیتیں اور اسی میں طواف کرتیں اور دوران طواف یہ شعر پڑھتی جاتیں:

الیوم یبدو بعضه او کله وما بدا منه فلا احله

''آج کچھ یا کل شرمگاہ کھل جائے گی لیکن جو کھل جائے میں اسے (دیکھنا) حلال نہیں قرار دیتی''۔[13]

اللہ تعالی نے اس خرافات کے خاتمے کے لیے فرمایا:

یبنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد...

''اے آدم کے بیٹو، ہر مسجد کے پاس اپنی زینت اختیار کرلیا کرو''۔[14]

بہر حال اگر کوئی عورت یا مرد برتر اور معزز بن کر بیرون حرم سے لائے ہوئے اپنے ہی کپڑوں میں طواف کر لیتا تو طواف کے بعد ان کپڑوں کو پھینک دیتا ان سے نہ خود فائدہ اٹھاتا نہ کوئی اور۔

قریش کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ وہ حالت احرام میں گھر کے اندر دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ گھر کے پچھواڑے ایک بڑا سا سوراخ بنا لیتے اور اسی سے آتے جاتے تھے اور اپنے اس اجڈ پنے کو نیکی سمجھتے تھے۔ قرآن کریم نے اس سے بھی منع فرمایا:

ولیس البر بان تاتوا البیوت من ظهورها ولکن البر من اتقی ج واتو البیوت من ابوابها

ترجمہ: اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور گھروں میں آؤ دروازوں سے۔[15] اسلام دین ابراہیمی میں ان بدعات کے خاتمے کے لیے آیا۔

عربوں کی اخلاقی خوبیاں

اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لیے شاید نمونہ اور مصلح ہونے کے لیے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

عرب حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے۔ وہ خطرات سے بے خوف تھے وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسری وقیصر کو انھوں ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پر جوش بھی تھے۔ اس لیے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا ان کے عزم و جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے

ٹکرا سکا۔ ہر جگہ وہ توحید کا علم لیے۔ بحروبر دشت وجبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم راسخ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔[۱۶]

عربوں کی جسمانی شجاعت و بہادری کے ساتھ ان کا دل شجاع اور بہادر تھا۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر تھی۔ اہل مدینہ میں نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی۔ یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔ عرب فطرت کے عطیہ عقل و دانش سے کافی طور پر بہرہ مند تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابوعبیدہ بن الجراحؓ وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہ نے علم و مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں۔ روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے شعرا کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں، ان کے فصحاء کے مقولے سنیے ان کی فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔[۱۷]

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی کے بعض قویٰ بیکار ہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قوی کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم سے محروم ہونے کے باوجود جہاں عرب کے بعض قوی بیکار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لیے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے شعرا اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو بر زبان یاد رکھتے تھے اور یہ ان کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیرت اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری حفاظت اور ذمہ داری کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ اور سینکڑوں اصحابؓ ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ اہل عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔[۱۸]

کرم و سخاوت اہل جاہلیت کا ایسا وصف تھا جس میں وہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے تھے اور اس پر اس طرح فخر کرتے تھے کہ عرب کے آدھے اشعار اسی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اسی وصف کی بنیاد کسی نے خود تعریف کی ہے تو کسی نے کسی اور کی۔ حالت یہ تھی کہ سخت جاڑے اور بھوک کے زمانے میں کسی کے گھر کوئی مہمان آ جاتا اور اس کے پاس اپنی ایک اونٹنی کے سوا کچھ نہ ہوتا جو اس کی اور اس کے کنبے کی زندگی کا واحد ذریعہ ہوتی تو بھی، ایسی سنگین حالت کے باوجود، اس پر سخاوت کا جوش غالب آ جاتا اور وہ اٹھ کر اپنے مہمان کے لیے اپنی اونٹنی ذبح کر

دیتا۔ ان کے کرم ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ بڑی بڑی دینی اور مالی ذمہ داریاں اٹھا لیتے اور اس طرح انسانوں کو بربادی اور خونریزی سے بچا کر دوسرے رئیسوں اور سرداروں کے مقابل فخر کرتے تھے۔

اس کرم کا نتیجہ تھا کہ وہ شراب نوشی پر فخر کرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ یہ بذات خود کوئی فخر کی چیز تھی بلکہ اس لیے کہ یہ کرم وسخاوت کو آسان کر دیتی تھی کیونکہ نشے کی حالت میں مال لٹانا انسانی طبیعت پر گراں نہیں گذرتا۔ اس لیے یہ لوگ انگور کے درخت کو کرم اور انگور کی شراب کو بنت الکرم کہتے تھے۔ ان کے کرم ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ جوا کھیلتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بھی سخاوت کی ایک راہ ہے کیونکہ انہیں جو نفع حاصل ہوتا، یا نفع حاصل کرنے والے کے حصے سے جو کچھ فاضل بچ رہتا سے مسکینوں کو دے دیتے تھے۔[19] اسی لیے قرآن پاک نے شراب اور جوئے کے نفع سے انکار نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ:

واثمهما اكبر من نفعهما

ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔

اسلام نے ان کی کرم وسخاوت کی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات وصدقات وزکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

وفائے عہد بھی دور جاہلیت کے اخلاق فاضلہ میں سے ہے۔ عہد کو ان کے نزدیک دین کی حیثیت حاصل تھی جس سے وہ بہر حال چمٹے رہتے تھے اور اس راہ میں اپنی اولاد کا خون اور اپنے گھربار کی تباہی بھی ہیچ سمجھتے تھے۔ خودداری و عزت نفس پر قائم رہنا اور ظلم و جبر برداشت نہ کرنا بھی جاہلیت کے معروف اخلاق میں سے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی شجاعت وغیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ فوراً بھڑک اٹھتے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر جس سے ذلت واہانت کی بو آتی، شمشیر وسناں اٹھا لیتے اور نہایت خونریز جنگ چھیڑ دیتے۔ انہیں اس راہ میں اپنی جان کی قطعاً پرواہ نہ رہتی۔

حلم و بردباری اور سنجیدگی بھی اہل جاہلیت کے نزدیک قابل ستائش خوبی تھی مگر یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی شجاعت اور جنگ کے لیے ہمہ وقت آمادگی کی عادت کے سبب نادر الوجود تھی۔

جس طرح عرب خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفہ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے۔ وہ امی تھے کہ ایک امی کی زبانی تعلیم کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح سے تیار رہیں۔ ان کی بدوی سادگی کی وجہ سے وہ تمدن کی آلائشوں اور داؤ پیچ سے ناواقفیت اور دوری اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سچائی اور امانت پائی جاتی ہے وہ مذہب کاری اور بدعہدی سے دور اور متنفر تھے۔

اہل عرب کے فطری اخلاق و کردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے وہ اہل ایران اور اہل ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آراء، اور نظریہ باز نہ تھے۔ وہ مجسم عمل تھے اور عملیت پسند تھے۔ وہ چوں چرا اور کیسے، کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے۔ وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے۔ اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتا پا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ دور دور سے بدوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے تھے اور شک و حجت اور مناظرہ و قیل و قال کے بغیر فرائض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلے میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے۔ وہ اگر مگر اور ممکن اور ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے وہ تعلیم کو دیکھتے اور سنتے تھے۔ وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کر لیتے اور اس پر عمل کر کے دینی و دنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے۔ اہل عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے اس کو پاک و مبرا رکھا۔[۲۱]

اہل عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لیے منتخب ہو چکی تھی۔ باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اس لیے ان میں ودیعت کیے گئے تھے تا کہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لیے خزانہ غیب کا کام دے۔ یہی وہ سرمایہ جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا نہ روم و فرہنگ میں اور نہ ترک میں تھا۔ وہ عرب اور صرف عرب میں تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لیے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے سپرد کی۔ آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں اسماعیلؑ کو پسند کیا اور اسماعیلؑ کی اولاد میں کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو''۔[۲۲]

ایک اور روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں۔ اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا مجھے اس نے ان سب میں سے بہتر نسل میں رکھا۔ ان کو دو حصوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصہ میں (یعنی عرب) میں بنایا جو سب سے بہتر تھا۔ پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا''[۲۳]

حوالہ جات

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، جلد چہارم، عالمین پبلی کیشنز پریس، (۱۹۹۲ء)، طبع ہفتم، ص ۲۹۵۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۹۱۔

۳۔ القرآن کریم، :۷۸۲۲۔

۴۔ علامہ سید سلیمان ندوی، بحوالہ سابقہ، ص ۲۹۲۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۹۳۔

۶۔ القرآن کریم، ۱۲۹:۲۔

۷۔ عبدالحلیم ندوی، عربی ادب کی تاریخ، مکتبہ تعمیر انسانیت، (لاہور، ۱۹۸۸ء)، ص ۶۲۔۵۷۔

۸۔ مولانا مودودی، سیرت سرور عالم، جلد اول، ص ۱۰۷۔۱۰۶۔

۹۔ علامہ سید سلیمان ندوی، بحوالہ سابقہ، ص ۲۹۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹۴۔

۱۱۔ شیخ محمد رفیق، تاریخ اسلام، حیدری پریس، (لاہور، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۷۔

۱۲۔ القرآن کریم، ۱۹۹:۲۔

۱۳۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، (ترجمہ) الرحیق المختوم، المکتبہ السلفیۃ، (لاہور، ۱۹۹۸ء)، ص ۶۴۔

۱۴۔ القرآن الکریم، سورۃ، ۳۱:۷۔

۱۵۔ القرآن الکریم، ۱۸۹:۲۔

۱۶۔ سید سلمان ندوی، بحوالہ سابقہ، ص ۲۹۶۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۷۔۲۹۶۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۹۷۔

۱۹۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، بحوالہ سابقہ، ص ۳۷۔۲۷۔

۲۰۔ القرآن الکریم، ۲۱۹:۲۔

۲۱۔ سید سلمان ندوی، بحوالہ سابقہ، ص ۹۹۔۲۹۸۔

۲۲۔ جامع ترمذی شریف، باب المناقب۔

۲۳۔ ایضاً۔